Fikr-o-Nasar (Islamabad) 19:8 (1982)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی اصلاحات

عبدالقدوس ہاشمی

الحمد للہ وحدہ والصلوۃ والسلام علی النبی الذی لا نبی بعدہ

دنیا میں ایسی تحریکیں بہت ہی کم پیدا ہوئی ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا ہو۔ کوئی تحریک صرف ایک پہلو کو متاثر کرتی نظر آتی ہے اور کوئی تحریک دو پہلوؤں پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اور بعض تحریکوں کا تو مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہلو کی اصلاح ہو جائے ۔ کوئی محض ایک پہلو مثلاً سیاسی صورت حال کی اصلاح چاہتی ہے اور کوئی بڑھتی ہوئی مادی وابستگی اور عیش کوشی سے لوگوں کو دور رکھنے کی ہدایات پر اپنا سارا زور صرف کر دینا پسند کرتی ہے۔ ایسی ہی یکرخی اصلاحی تحریکوں میں سے چین کے بوڑھے فلسفی لاؤزے کی تحریک تاؤمت ، ایران کے عظیم المرتبت فلسفی زردشت اعظم کی تحریک ، شری وردھمان مہا بیرجی کی تحریک جین مت اور گھورتپسیا اورمہاتما بدھ کی تحریک بدھ مت وغیرہ ہیں۔

اسلام ایسی کوئی یکرخی تحریک نہیں ہے بلکہ ایک ہمہ گیر نظام زندگی ہے۔ اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں جس طرح زندگی بسر کرنے کی ہدایات دی تھیں ، ان ہی کا نام اسلام ہے۔ قرآن مجید میں تو بار بار یاد دلایا گیا ہے کہ دین ہمیشہ سے اسلام

ھی رھا ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی تیرھویں آیت میں وضاحت کے ساتھ اطلاع دی گئی ہے کہ جو شریعت تم کو دی جا رھی ہے اور جو دین تمہیں دیا گیا ہے یہ وھی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو اور حضرت ابراھیم علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ حتی کہ لفظ مسلمین کے ساتھ سورۃ الحج کی آیت نمبر ۷۸ میں بتایا گیا ہے کہ یہ تمہارے باپ حضرت ابراھیم علیہ السلام کی ملت ہے ان ھی نے تمہارا نام مسلمین رکھا ہے۔

ھمیں مذھبی افسانوں اور آثار قدیمہ کے ذریعہ جو تاریخی معلومات حاصل ھو سکی ھیں وہ بھی یہی بتاتی ھیں کہ بنی نوع انسان کا اولین مذھب توحید تھا ، یعنی موتوتھزم ھی انسان کا اولین مذھب ہے اور اسی عقیدہ کے ماتحت انسانوں کے اعمال و حرکات میں تنظیم پیدا ھوئی ہے۔ اقوام قدیمہ کے افسانوں میں اسمائے معرفہ بدلے ھوئے تو ملتے ھیں لیکن عقیدہ توحید کامل یا ناقص صورت میں ھر قوم میں موجود ہے۔

اس کے بعد قوموں نے صفات الٰہی کی تجسیم کی یا مخلوقات میں صفات الٰہی کو مرکوز کیا ، اس طرح عقاید وافکار میں خرابیاں پیدا کیں اور ان افکار کے زیر اثر اعمال و حرکات وجود میں آئیں ۔ ھر قوم میں ھادی و رھنما آئے اور انھوں نے اول عقاید کی اور پھر اعمال کی اصلاح کی ۔

چونکہ انسانی اعمال کا ایک بڑا بلکہ بہت بڑا حصہ انسان کی معاشی جدوجہد ھوتا ہے ، اس لئے لازمی طور خرابیاں سب سے زیادہ اس کے معاشی اعمال میں نمایاں ھوئیں ۔ عقاید کی خرابی کا اثر انسان کی ان حرکات پر پڑا جو ایک آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی

ضــروریات زندگی مہیا کرنے کے لئے کرتا ہے ، معــاملات میں دھوکا ، فریب ، لوٹ کھسوٹ ، چور بازاری ، ذخیرہ اندوزی ، چوری اور جیب تراشی وغیرہ ، یہ سب انسان کے عقائد کی کمزوری اور خالق کائنات پر کامل اعتماد کے فقــدان کا لازمی نتیجــہ ہے ۔ اگــر کوئی شخص اللہ تعالی پر پورا بھروسہ رکھتا ہے کــہ محنت کرنے والے کو اس کا صلــہ ضــرور دے گا ، اور اگر اس کا بھی یقین ہے کہ اس کو اپنے اعمال کیلئے ایک دانا وبینا اللہ جل جلالہ کے سامنے جواب دہ ھونا ہے تو اس کی معاشی جدوجہد اس قسم کے اعمال کی صورت اختیار نہیں کر سکتی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کے جس دور میں پیدا ھوئے وہ اجتماع نوع انسانی کے پھیلاؤ کا وسیع ترین دور تھا ۔ مشرق و مغرب میں تجارتی تعلقات پوری طرح قائم ہو چکے تھے ۔ ساری دنیا کے لوگوں میں مقــامی اور بین الاقوامی لین دین ھونے لگے تھے ۔ دنیا میں بڑی بڑی حکومتیں اور بادشاھیاں پیدا ھو چکی تھیں ۔ شان وشکوہ اور اسراف و تبذیر کی بدترین صورتیں موجود تھیں ۔ اس لئے یہ ضروری تھا کــہ حضرت آدم علیہ الســلام کا دین اســلام اور حضرت نوح علیہ الســلام کی شریعت پھر سے اور مکمل صورت میں قائم کی جائے تو عقــاید و عبادات کے ساتھ ساتھ معــاشی جدوجہد اور معــاملات کی بھی اصــلاح کی جائے ۔ اگــر اس کی طرف پوری توجــہ نہ دی جاتی تو انسانیت کا بڑا نقصان ھوتا اور دینی نظام ناقص کا ناقص رہ جاتا ۔ اس لئے آخری پیغمبر اســلام نے عقاید و عبادات کے بعد سب سے زیادہ توجہ معاشی اصــلاحات کی طرف مبذول فرمائی ۔

معــاشیــات کی [illegible]

معــاشی اصــلاحات پر گفتگو [illegible] ھوئے سب سے پہلا سوال یہ پیدا

ISLAMIC RESEARCH INSTITUTE LIBRARY

ہوتا ہے کہ انسانی اعمال میں معاشی جدوجہد کو کیا مرتبہ دیا جائے ، کیا تقرب الٰہی حاصل کرنے کیلئے معاشی جدوجہد سے کنارہ کش ہو کر مٹھوں ، وھاروں ، اور خانقاھوں میں بیٹھ رھنا ضروری ہے۔ یا تعذیب نفس کرنا ، ترک دنیا کرکے جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کرنا مفید ہے۔ انسان نے یہ صورتیں پیدا کر رکھی تھیں حالانکہ اسے خبر تھی کہ یہ ساری صورتیں فطرت کے خلاف جنگ کی ھیں ۔ سارے انسان تو کیا ایک فرد واحد بھی پوری طرح ترک دنیا نہیں کر سکتا ، وہ اگر صحرا نشین ہو جائے گا پھر بھی اس کے گردوپیش دنیا ھی ہوگی ۔ وہ معاش کے معروف طریقوں کو چھوڑ بھی دے گا تو بارش ، دھوپ اور سردی سے بچنے کیلئے کسی کھوہ اور غار کی ضرورت باقی ھی رھے گی ۔ وہ پیاس بجھانے کیلئے چشمۂ آب تک ضرور جائے گا اور بھوک میں جنگلی پھل ضرور بٹورے گا ۔ وہ وھارا میں رہ کر بھیک پر گزارا تو کرے گا لیکن بھیک دینے والوں کو بھیک دینے کیلئے معاشی جدوجہد کرنی ھی پڑے گی

ایک بزرگ کسی خانقاہ میں چلہ ومراقبہ تو کریں گے لیکن ان کیلئے ضروریات زندگی بہت سے مریدوں کی معاشی جد وجہد ھی سے مہیا ہو سکیں گی .

انسان نے اپنی نادانی سے جو یہ تصور قائم کر رکھا تھا کہ معاشی جدوجہد تقرب الٰہی کے راستہ میں حائل ہے ، حضور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح کی ، اور بار بار یہ وضاحت فرمائی کہ معاشی جدوجہد کا مرتبہ عبادت الٰہی کے برابر ہے ، بلکہ کسب حلال خود اپنی جگہ پر ایک عبادت ہے ، بندۂ مؤمن کو روزی کمانے کا دنیوی فائدہ ھی نہیں بلکہ اخروی ثواب بھی ملے گا ۔ کسب حلال اللہ تعالی کا حکم ہے ۔ اس کی خلاف ورزی معصیت اور گناہ ہے ۔ معاشی

جدوجہد تقرب الٰہی کی راہ میں حائل نہیں بلکہ تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے ایک بندۂ مومن حلال مال کیلئے جو محنت کرتا ہے، اس کی وجہ سے وہ اللہ کا پیارا اور حبیب ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا کہ :-

(۱) جو ایک پودہ بھی زمین پر لگاتا ہے وہ نیک عمل کرتا ہے جس کے صلہ میں وہ جنت کے باغوں کا مستحق قرار پاتا ہے (زراعت)

(۲) ایمان دار تاجر قیامت کے دن عرش اعظم کے سایہ میں جگہ پائے گا۔(تجارت)

(۳) محنت اور مزدوری کرکے حلال روزی کمانے والا اللہ تعالی کا حبیب دوست ہوتا ہے۔(محنت)

اسی طرح رزق حاصل کرنے کے جتنے ذرائع جائز ہیں، ان سب کی تعریف فرمائی۔ لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان ذرائع کو اختیار کریں اور رزق حلال حاصل کریں۔ یہی خالق کائنات کا حکم ہے اور انہیں صرف دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی بڑا صلہ ملے گا۔

صرف دولت

دوسرا اہم سوال جو کچھ ہم کمائیں اس کے صرف کرنے کا ہے۔ انسان کی ضروریات اور ان کی تکمیل کیلئے دولت کی پیدائش، یہ ایک اہم سوال ہے۔ انسان نے اس میں بڑی بڑی خرابیاں پیدا کر رکھی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ انسانی میں بے پناہ خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضروریات انسانی کی اگر صحیح تبویب و تقسیم کی جائے تو حسب ذیل قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱)ضروریات زندگی : یعنی ایک انسان کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی زندگی کیلئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً

غذا ، پانی ، مکان ، لباس ، دوا وغیرہ۔

(۲)ضروریات کارکردگی : یعنی ایک آدمی کو اپنا کام جاری رکھنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسان کیلئے ہل ، بیل ، ٹریکٹر وغیرہ ، صنعت کار کیلئے اوزار ، آلات وغیرہ ، تاجر کیلئے گودام اور سائبان وغیرہ ۔

(۳)ضروریات توانائی یا ارجاع توانائی : یعنی آدمی اپنی حرکات میں اور جدوجہد میں اپنی توانائی کا جو حصہ صرف کرتا ہے۔ اس کے پھر سے واپس لانے کی تدابیر کے سلسلہ میں جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں ، مثلاً سیر ، تفریح ، ورزش وغیر

ان تینوں اقسام ضرورت کو شریعت اسلامی نے قبول کیا ہے اور ان کی تکمیل کیلئے جدوجہد کو محمود اور قابل تعریف قرار دیا ہے۔ البتہ ان کی تکمیل کے سلسلہ میں اعتدال سے باہر قدم رکھنے کی ممانعت کر دی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال کی راہ مستقیم پر رہنے کے سلسلہ میں بہت سی ہدایات دیں مثلاً کھانے پینے میں حرام و حلال کی پابندی قائم رکھو۔ ایسا مکان نہ تعمیر کرو جو ضرورت سے زاید ہو اور جس میں سکونت مقصود ہی نہ ہو۔ جب خود کھاؤ پیو تو یہ یاد رکھنا کہ ہمسایہ بھوکا تو نہیں ہے۔ سائل اور محروم کے حق سے غافل نہ ہو جاؤ ۔ قرابت داروں کے حقوق و ضروریات یاد رکھو اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کا سلوک کرتے رہو ۔وغیرہ وغیرہ ۔

ان تینوں مباح ضروریات زندگی کی تکمیل کے سلسلہ میں اعتدال کا دامن چھوٹنے کے بعد کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ ان کے معلوم کرنے کیلئے کسی کو عظیم مفکر یا فلسفی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک ذی ہوش آدمی اپنے گردوپیش نظر ڈال کر بہ آسانی معلوم کر سکتا

ہے کہ بے اعتدالی کی وجہ سے کس قدر رشک وحسد ، مخاصمت اور دشمنی اور سب سے زیادہ معاشی ناھمواری پیدا ھوتی ہے ۔ شداد کی طرح لوگ جنت ارضی تعمیر کرنے اور مہاراجہ دربھنگہ کی طرح سورگ بھون بنانے کے سلسلہ میں کیا کچھ نہیں کر گزرتے ۔ رنگ محل کی تعمیر اور پانی محل بنوانے میں کتنے مزدوروں سے بغیر ادائے اجرت بیگار لی گئی ۔ شہزادی کلوپٹرا ، روم کی ملکہ اور خود مسلمان شہزادی شجرۃ الدر کے ملبوسات کی تیاری میں کاریگروں پر کیا گزری

ان تینوں ضروریات کے علاوہ آدمی دو اور قسموں کے ماتحت اپنی دولت کو صرف کرتا ہے ۔ قرآن مجید نے ان دونوں صورتوں کو ممنوع قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الہی ان کی ممانعت کی اور لوگوں کو اس سے بچایا ۔ یہ دونوں صورتیں اصطلاح قرآنی میں اسراف اور تبذیر کہلاتی ھیں ۔

(۱) اسراف یہ ہے کہ جہاں پر جتنے خرچ کی ضرورت ھو ، اس سے زیادہ خرچ کیا جائے ۔ چاھے وہ کام اچھا ھی ھو ، قابل تعریف ھو مگر اس میں ضرورت سے زاید خرچ اسراف ہے ۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا ۔

س ۔ کیا وضو کرنے میں بھی اسراف ھو سکتا ہے ؟ آپ نے فرمایا ۔

ج ۔ ھاں ، اگرچہ تم ایک بہتی ھوئی ندی ھی کے کنارے پر وضو کر رھے ھو ۔

جواب بالکل واضح ہے کہ وضو جیسے عمل عبادت میں بھی پانی ضرورت سے زیادہ صرف کیا جائے تو یہ عمل اسراف ھو گا ، اور اسراف سے اللہ تعالی نے قرآن مجید میں صریح ممانعت فرمائی ہے ۔ لیکن اس جواب کی بلاغت پر غور کیجئے ، فن معاشیات کا ایک سوال اس سے

حل ہو جاتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ رسد اگر کثیر ہو تو کیا طلب کو بھی بڑھا دینے کی اجازت ہے ؟ میں تو کوئی ماہر معاشیات نہیں ، ایک ماہر معاشیات اس کے خطرات سے پوری طرح واقف ہے کہ طلب کی زیادتی کا اثر قیمتوں پر ، دوران زر پر ، اور افراط زر پر کیسا پڑے گا ۔

(۲) ناجائز خرچ و اخراجات کی دوسری قسم تبذیر ہے۔ لغت میں تبذیر کے معنی ھیں کھیتوں میں بیج کا چھٹنا اور پانی کو ایسا گندہ کر دینا کہ پانی کا رنگ بدل جائے ۔ اصطلاح شرعی میں اس کے معنی ھیں مال کا بیجا صرف کرنا ، اپنے اس خرچ کی نمائش کرنا ، اور اس پر فخر کرنا ۔ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں عمل تبذیر سے اپنی نفرت کا اظہار فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی شدت کے ساتھ ممانعت کی ۔ بلکہ لوگوں کی عادتوں کو بدل دیا ۔ ھمیں دولتمند صحابہ کرام مثلاً حضرت سعد بن عبادہ ؓ حضرت عبدالرحمن ؓ بن عوف اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ وغیرہ کے اعمال میں کہیں تبذیر کا شائبہ بھی نہیں ملتا ۔

ان پانچوں محل اخراجات کی آپ نے اپنے قول و فعل کے ذریعہ پوری طرح وضاحت کی ، اور جائز و ناجائز اخراجات و مصارف کے مابین ایسا خط فاصل کھنیچ دیا کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیان ؓ لکھ پتی باپ کے لکھ پتی فرزند بھی اپنی خلافت و جلالت کے دور میں پیوند لگا ھوا کرتا پہن کر سڑک پر چلنے اور مسجد میں نمازوں کی امامت کرنے میں کوئی شرم نہیں محسوس کرتے تھے حالانکہ ان سے پہلے کے خوش حال لوگ جو دولت و جلالت میں ان سے بدرجہا کمتر تھے ، اعلی درجہ لباس اور قیمتی چادر دوش پر ڈالے بغیر نکلنے میں شرماتے تھے ۔ ابو جہل بن شرحبیل ، ابولہب بن عبدالمطلب اور جبلہ بن ایہم کبھی

یہ نہیں برداشت کرتے تھے کہ گھٹیا لباس میں لوگوں کے سامنے آئیں ۔ یہودی دولتمند ، ابوالحقیق ، عبداللہ بن ابی ، حئی بن اخطب ہمیشہ اپنی دولت کے مظاہرے کیا کرتے تھے ۔ اور جاہلی معاشرے کی ہمیشہ یہی کیفیت تھی کہ اسراف وتبذیر پر فخر کیا جاتا تھا ۔ جاہلی عرب شاعری کا سارا ذخیرہ اس پر شاہد ہے کہ وہ کس طرح اسراف و تبذیر میں مبتلا تھے ۔

پیدائش دولت

صرف دولت کی اس مختصر سی بحث کے بعد ہم جب پیدائش دولت پر غور کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصلاحی ہدایات دیں اور ان پر جس پابندی کے ساتھ عمل کرایا اس نے معاشیات کی بگڑی ہوئی شکل کو اصلاحات کے ذریعہ سنوار کر خوش نما بنا دیا ۔ ورنہ حرص کے داغ سے پیدائش دولت کی جدوجہد کا چہرہ ہمیشہ گھناؤنا رہا ہے ۔

آج کل فن معاشیات میں عوامل پیدائش دولت چار یا پانچ بتائے جاتے ہیں ۔ یہ محض دقت پسندی ہے ۔ حقیقتاً نہ سرمایہ عامل پیدائش ہے اور نہ ذہن منتظمہ اور نہ حوصلہ کار بار ۔ سرمایہ پچھلی کسی محنت کا غیر صرف شدہ بچا ہوا حصہ ہے اور ذہن منتظمہ و حوصلہ انسانی محنت کی ایک قسم ہے ۔ حقیقی عوامل پیدائش دولت صرف دو ہیں ۔ ایک زمین اور دوسرا انسان یعنی محنت ۔ اس واقعیت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہم جن اشیاء سے اپنی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں وہ سب بلا استثناء زمین یا معاشی زبان میں اصل قائم سے براہ راست یا بالواسطہ ہمیں حاصل ہوتی ہیں ۔ اور انہیں ہماری ضرورت میں کام آنے کے قابل جو طاقت بناتی ہے وہ انسانی محنت ہے ۔ اس لئے حقیقی

عوامل صرف دو ھیں ۔ ، زمین اور انسان ۔ یہ دونوں عوامل ایسے ھیں کہ ان کے پیدا کرنے میں ھمارا کوئی حصہ نہیں ہے ۔ ۔ یہ تمام تر رب العلمین کا عطیہ ھیں ۔ شاید اسی حقیقت کو یاد رکھنے کیلئے اللہ تعالی نے قرآن مجید کی اولین سورۃ کی اولین آیت میں اپنا تعارف کسی اور صفت الٰہیہ کے ذریعے نہیں کرایا بلکہ الحمد للہ رب العلمین کہا ۔ ساری تعریفیں صرف اس اللہ کو سزاوار ھیں جو سارے عالم والوں کا پالنے والا ہے ۔ اور شاید اسی لئے بار بار یہ حقیقت یاد دلائی گئی ہے ۔ کہ زمین ، آسمان ، سورج ، چاند ، ستارے ، بادل ، بارش ، کھیت ، باغ ، جانور اور وہ نطفہ بھی جس سے انسان پیدا ھوتے ھیں اللہ جل شانہ کے پیدا کئے ھوئے ھیں ۔ کسی انسان کے بس کی بات نہیں کہ ان میں سے کچھ بھی بنا سکے ۔ یہ عقیدہ و ایمان ھی نہیں ہے بلکہ حقیقت و واقعہ ہے جس سے انکار ہٹ دھرمی کے سوا کچھ بھی نہیں ۔

اس واقعیت کے اثرات و نتائج کو دیکھئے ، علم المعیشت میں اس سے انقلاب عظیم بپا ھو گیا ۔ اور بقول مرحوم علامہ اقبال ؒ

اس سے بڑھکر اور کیا فکروعمل کا انقلاب
بادشاھوں کی نہیں ، اللہ کی ہے یہ زمین

اللہ تعالی کی عطا کی ھوئی کسی شئے میں محنت کرکے روزی کمانے کا حق ھر انسان کو حاصل ہے ۔ اور جب وہ اپنی محنت سے اس شئے کو ضروریات میں سے کسی ضرورت کی تکمیل کے قابل بنالے تو پھر اس شئے کا مالک ہے اور اسے حق حاصل ہے کہ کسی کو مفت دے دے یا بتراضی طرفین اس کے ھاتھ فروخت کر دے ۔ اسی لئے ھدایات نبوی کے بموجب دریا یا تالاب کے پانی پر ، خود رو گھاس اور پھول پھل پر جو پکڑ کر یا پال کر کسی نے نہ رکھے ھوں ، ایسے جانور اور پرندوں پر کسی

شخص کا کوئی ترجیحی حق نہیں ہوتا اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ دوسروں کو اس سے استفادہ کرنے سے روکے ۔

تبادلہ دولت

ہر شخص جو کچھ زمین یا باغ سے پیدا کرے یا اپنی صنعت وحرفت سے بنائے اس کو خود ہی خرچ کر دے ، نہ ایسا ممکن ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ضرورتمند تک ان تمام چیزوں کو دور دراز سفر کرکے خود پہنچائے ، اس لئے تبادلہ دولت کے ایسے قواعد و ضوابط ضروری ہیں کہ کاشتکار صناع یا صرف کنندہ پر ظلم نہ ہو سکے ۔ اس کا بنیادی اصول قرآن مجید میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تبادلہ دولت باہمی رضامندی سے ہو ۔ ظلم و تعدی یا دھوکا ، فریب کی آلودگی اسے ناپاک نہ بنا دے ۔ اگر کوئی تبادلہ دولت کے اس بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرے تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ اس شخص کو سزا دیں ۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۳۳ میں ہر فسادی کو سزا دینے کا ذکر موجود ہے ۔ مسلمانوں کو اختیار حاصل ہے کہ فسادی کو سخت سے سخت سزا دیں ۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ بلاواسطہ یا بالواسطہ ایسی صورت پیدا کرے جس میں خریدار ، خریدنے پر یا فروشندہ فروخت کرنے پر مجبور ہو جائے ۔

اسی طرح ذخیرہ اندوزی ، چور بازاری اور کسی چیز کو اس کا نقص بتائے بغیر فروخت کرنے کی ممانعت ہے اور یہ سارے جرائم دنیا میں قابل سزا اور آخرت میں موجب عذاب عظیم ہیں ۔ ہر اس مقام پر جہاں مسلمان بااقتدار ہوں مسلمانوں پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ ایسے مجرموں کو سزائیں دیں اور معاشرہ سے ان جرائم کو دفع کریں ۔

تبادلہ دولت میں اتنی اصلاحات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہیں کہ ان سب کا تفصیلی بیان کسی ایک مختصر سے مضمون میں

نہیں سما سکتا ۔ لیکن مندرجہ بالا حکم کے علاوہ تین احکام وہ ہیں جن کا مختصر بیان ضروری ہے۔

(۱) سٹہ کی بالکلیہ ممانعت : فروخت کی جانے والی چیز اور اس کی قیمت ، دونوں کی غیر موجودگی میں ہر بیع یا معاہدہ بیع ناجائز ہے۔ بڑی سختی سے ایسی بیع یعنی معاملہ خریدوفروخت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ معاشی نقطہ نظر سے بھی سٹہ نہایت ہی غیر عادلانہ اور نقصان رسان معاملہ ہے۔ اس کی وجہ سے ضروری اشیاء پیدا کرنے والے کو کم سے کم قیمت ملتی ہے اور صارف کو اشیائے صرف کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ صورت غیر منصفانہ بلکہ صریحاً ظلم ہے ، اس کی آپ نے ممانعت فرما دی ۔

(۲) سود کی حرمت : سود جسے عربی میں ربوا کہتے ہیں ، اس کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں اور ہر صورت میں سود حرام ہے چاہے سودی قرض لینے والے نے اسے اپنی ذاتی ضرورت کیلئے لیا ہو یا کاروباری ضرورت کیلئے ۔ چاہے ربوا الفضل ہو یعنی اصل قرض دی ہوئی رقم پر کوئی اضافہ وصول کیا جائے یا ربوا النسیہ ہو یعنی کوئی شے فروخت کرکے یہ شرط لگا دی جائے کہ اتنی مدت کے اندر اس کی قیمت ادا نہ کی جائے تو اس قدر زیادہ رقم ادا کرنی ہو گی ۔ سود ہر صورت میں حرام ہے۔ اور اس شدت کے ساتھ اس کی حرمت بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ حرمت کا حکم آ جانے کے بعد بھی سود لیں تو ان کے خلاف اللہ ورسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے۔

سود میں اضافہ بمقابلہ وقت تسلیم کیا جاتا ہے حالانکہ یہ قانون فطرت کے بالکل بر خلاف ہے ، کسی سرمایہ میں بمقابلہ وقت کوئی اضافہ کبھی نہیں ہو سکتا ۔ یہ قانون فطرت کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔

سود کا ہر معاملہ یکطرفہ معاہدہ ہوتا ہے اور یکطرفہ معاہدہ دنیا کے کسی قدیم و جدید اصول قانون میں جائز نہیں ہے۔ سود کے ذریعہ اشیائے صرف کی قیمتوں میں غیر حقیقی اضافہ ہو جاتا ہے جس کا بوجھ غریب صارف پر پڑتا ہے۔ سود کی وجہ سے دولت کا بہاؤ ایک خاص طبقہ کی طرف ہو جاتا ہے اور شدید معاشی ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ سود کی وجہ سے ساہوکار معاشی جدوجہد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا اور دوسروں کی کمائی مفت کھاتا رہتا ہے۔ اس طرح ایک سود خوار معاشرہ کا ایک بے عمل فرد بن جاتا ہے۔ اس لئے معاشی سوجھ بوجھ کا یہی تقاضا ہے کہ سود کی حرمت پر زور دیا جائے اور اس لعنت سے معاشرہ انسانی کو نجات دلائی جائے۔

آنحضرتؐ کی دیگر معاشی اصلاحات سے صرف نظر کرکے بھی دیکھا جائے تو سود کے خلاف جو آیات قرآنی نازل ہوئیں اور آپ نے جس شدت کے ساتھ اس پر عمل کرایا۔یہ بہت بڑی اصلاح اور معاشی نقطہ نظر سے بڑا دوررس انقلابی اقدام ہے۔

(۳) قانون وراثت : قانون وراثت خود اپنی جگہ پر بڑی اہم معاشی اصلاح ہے۔ قدیم اقوام میں عام طور پر وراثت اکبر جسے انگریزی میں پرایموجنریشن کا قاعدہ کہا جاتا ہے ، رائج تھا ۔ ایران میں ، رومن حکومت میں ، چین میں اور ہندوستان میں یہ طریقہ رائج تھا کہ باپ کی وفات پر صرف اس کی سب سے بڑی اولاد وارث ہوتی تھی ۔ ، دوسری اولاد کو یا وارثوں کو وراثت سے محروم سمجھا جاتا تھا ، اور چین و ہندوستان میں تو عورت کبھی وارث ہوتی ہی نہ تھی۔

اس ناانصافی کی اصلاح قرآن مجید نے اس طرح کر دی کہ تفصیل کے ساتھ وارثوں کے حصے مقرر کر دیے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ

هوا که دولت مالدار کی وفات کے بعد خود بخود تقسیم ہو گئی اور بڑی بڑی جائیدادوں کے وراثتی دولتمندوں کا کاہل و بے عمل طبقہ ختم ہو گیا۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ دو بھائیوں اور بھائی بہنوں کے مابین محبت والفت کے رشتوں کو باقی رہنے کا موقع میسر آ گیا ۔ ورنــہ وراثت اکبر اور عورتوں کی وراثت سے بالکلیہ محرومی نے بھائی بہنوں کے مابین محبت والفت کو جس طرح تباہ کیا ہے ، وہ ایک بڑی دردناک داستان ہے جس سے تاریخ کا ہر طالب علــم واقف ہے ۔

اســلام کے قانون وراثت پر جن مسلم وغیر مسلم علماء سے میری گفتگو ہوئی ہے ان سب نے اس کی تعریف کی ہے بجز ایک روسی سفیر صاحب کے جنھوں نے فرمایا کہ دنیا میں کسی قانون وراثت کی ضرورت ھی نہیں ، ان کا بیان ہے کہ روس میں بھی قانون وراثت ہے مگر نہ ہوتا تو اچھا تھا ۔ یہ ان کا شخصی خیال ہے جس کے قائم کرنے میں وہ یہ بھول گئے کہ قانون وراثت مرنے والے کی آخری تمنا کی تکمیل ہے ۔ اب تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی مرتے ہوئے یہ تمنا نہ ہو کہ وہ جو کچھ چھوڑ کے جا رہا ہے چاہے وہ ایک پرانا کمبل ھی کیوں نہ ہو ۔ اس متروکہ سے اس کی وفات کے بعد وہ لوگ فــائدہ اٹھائیں جو زندگی میں اس کے پیارے اور قریبی رشتہ دار تھے ۔

البتہ بعض مسلمان بھائیوں نے اسـلامی قانون وراثت پر دو ، اعتــراضات کئے ۔ دو ایک حضرات نے تو صرف اس موضـوع ھی پر تفصیلی گفتگو فرمائی ۔ مختصراً اس کی توضیح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ دوسرے اھل علم بھی صحیح طور پر بات کو سمجھ لیں ۔

(۱) پہلا اعتراض یہ تھا کہ قانون وراثت میں یتیــم پوتے کو دادا کی وراثت سے محروم کیوں قرار دیا گیا ہے جب کہ مورث کا دوسرا بیٹا موجود

هو تو پوتا محروم هو جاتا ہے۔

(۲) دوسرا اعتراض یہ تھا کہ قانون وراثت میں بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے کیوں دیے جاتے هیں۔

پہلا اعتراض اس لئے ذهن میں آ سکا ہے کہ وصیت اور وراثت کے سارے قانون پر غور نہیں کیا گیا ورنہ بات سمجھ میں آ جاتی۔ اور جب ان کے سامنے وصیت کے متعلق بتایا گیا تو معترض کی سمجھ میں بات آ گئی۔ اور ان دو امور پر غور کیجئے:۔

هر شخص پر واجب ہے کہ اگر وہ ضرورت سمجھے تو مال متروکہ کی ایک تہائی تک پوتے یا کسی غیر وارث کیلئے وصیت کر دے۔ اور وصیت اتنی ضروری چیز ہے کہ حسب فرمان نبوی کسی مسلمان پر ایک رات بھی نہ گزرنے پائے جب کہ اس کا لکھا ہوا وصیت نامہ تیار نہ ہو۔

ولایت کا قبول کرنا اختیاری عمل نہیں بلکہ لازمی اور اجباری ہے۔ کوئی چچا اپنے یتیم بھتیجے کا ولی بننے سے انکار کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اگر چچا کی مالی حالت کمزور ہو اور بھتیجے کی پرورش وپرداخت کا بوجھ نہ برداشت کر سکتا ہو تو اس کی درخواست پر بیت المال سے مناسب امدادی وظیفہ بطور استحقاق اسے دیا جائے گا۔ چچا پر فرض ہے کہ وہ اپنے یتیم بھتیجہ کی اپنی اولاد کی طرح پرورش وپرداخت کرے حکومت کی انتظامیہ اور عدلیہ دونوں پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ چچا کو اس ولایت کیلئے مجبور کرے۔

ان دونوں احکام کو یعنی وصیت اور ولایت کو دیکھئے تو یہ واضح هو جائے گا کہ قانون وراثت نے یتیم پوتے کو بے یار ومددگار نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کو هر طرح تحفظ عطا کیا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسے مرحوم باپ کا جانشین قرار دے کر وارث کیوں نہ قرار دیا گیا ؟

تو اس میں بہت سی خرابیاں تھیں منجملہ ان کے دوخرابیاں تو ظاہر ہیں ایک یہ کہ جو بیٹا مورث کا زندہ ہے وہ بغیر کسی وجہ کے آدھی وراثت سے محروم ہو جاتا ، اور اس امکان سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چچا کے دل میں جو یتیم بھتیجے کی محبت ہوتی ہے وہ اس کے مقابلہ کی وجہ سے متاثر ہوتی حالانکہ پوتے کو بہرحال اپنے چچاھی ولایت میں جوان ہونا اور پروان چڑھنا تھا ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ھی باپ کی وراثت کا مستحق ہے۔ یہ اصول ھی قائم نہیں رھتا ۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے ۔ مثلاً زید کے دو فرزند تھے ۔ ایک حامد اور دوسرا محمود ، حامد کا ایک فرزند ہے علی ۔ پہلے حامد کا انتقال ہو گیا ۔ اس کے متروکہ مال میں حامد کے بھائی محمود کو حامد کے فرزند علی کے ہونے کی وجہ سے کوئی حصہ نہ مل سکا ۔ اور وہ علی کے باپ حامد کی وراثت سے محروم ہو گیا ۔ اب تھوڑے دنوں کے بعد محمود کے باپ زید کی وفات ہوئی تو محمود اپنے باپ کا وارث ہوا ۔ علی اپنے باپ حامد کا وارث ہوا تھا ، اور محمود محروم ہو گیا تھا تو یہ کیسا انصاف ہوا کہ محمود کے باپ زید کا وارث علی ہو اور علی کے باپ حامد کی وراثت سے محمود محروم ہو پھر بھی چچا ہونے کی وجہ سے علی کی ساری ذمہ داری محمود پر عاید ہو جائے ۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ بیٹی کو ایک حصہ اور بیٹے کو دو حصے کیوں ملتے ہیں ۔ اس کیلئے بیٹا اور بیٹی کی کیفیت پر غور کیجئے ۔ بیٹے کو اپنی بیوی اور بال بچوں کا کفیل ہونا ہے یا اس وقت کفیل ہے ، اس کو مالی استواری کی ضرورت بیٹی سے زیادہ ہے۔ بیٹی اور اس کی اولاد کی کفالت اس کے شوہر کے ذمہ ہے ، خود اس کی اپنی ذات کا بار بھی اس پر نہیں ہے ، یہ کتنی بڑی بے انصافی ہوتی کہ اخراجات کا

بوجھ جس پر ہے اس کے برابر حصہ پاتا جس کا اپنا بوجھ بھی دوسرے شخص پر ہے۔ کوئی دانشمند ایسا غلط فیصلہ نہیں کر سکتا ۔ اس لئے قرین انصاف اور تقاضائے ضرورت دونوں کا فیصلہ یہی ہے کہ بیٹے کو بیٹی سے دوگونہ وراثت ملے ۔ ۔

غرض یہ کہ اسلام ایک ہمہ گیر نظام حیات ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے ہر رخ کی اصلاح فرمائی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آپ ﷺ معاشی زندگی کی اصلاح نہ فرماتے ۔ انسان کی ساری حرکت صرف معاشی نہیں ہوتی ہے لیکن ہر انسان کے اعمال میں معاشی جہد کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ آپ نے بڑی توجہ کے ساتھ اللہ تعالی کا پیغام پہنچایا اور ایسی معاشی اصلاحات جاری فرمائیں جن کی وجہ سے حقیقہ ایک نمونہ کا صالح معاشرہ پیدا ہو گیا ۔ کاش کہ ہم مسلمان اپنی غفلت سے بیدار ہوں اور پھر سے ان ساری اصلاحات پر خلوص کے ساتھ عمل کرکے نمونہ کا معاشرہ پیدا کر دیں ۔ اللہ تعالی نے تو ہمیں یہی ہدایت فرمائی ہے کہ نبی (علیہ الصلوۃ والسلام) تمہارے لئے نمونہ ہیں اور تمہیں ساری دنیائے انسانیت کیلئے نمونہ بن جانا چاہیئے ۔

اللہم وفقنا لذالک . آمین